● کردقومیت کی تحریک ۱۹۹۰ء کی دہائی میں

The Kurdish Nationalist Movement in the 1990s. Edited by Robert Olson. (Lexington, Ky.: The University Press of Kentucky, 1996. 208 pp.)

● ایران: انقلاب کے بعد

Iran After the Revolution. By Saeed Rahnema and Sohrab Behadad. (New York, I.B. Tauris, 1996. 292 pp.)

● فلسطینی ریاست کی تشکیل

Building a Palestinian State. By Glenn E. Robinson. (Bloomington, Ind.: Indiana University Press, 1997. 228 pp.)

● الجزائر کی اذیت

The Agony of Algeria. By Martin Stone. (New York: Columbia University Press, 1997. 274 pp)

مشرق وسطیٰ پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے مندرجہ بالا کتب بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان تمام کتابوں میں اس وسیع اور متنوع علاقے کے کسی نہ کسی مسئلے پر قیمتی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مسائل ماضی کا ہی تسلسل ہیں۔ مثلاً اردن میں شاہ حسین ۱۹۵۲ء سے حکمران چلے آئے ہیں (اور اب ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند شاہ عبداللہ مسند حکمرانی سنبھالے ہوئے ہیں)۔ مصر میں جمال عبدالناصر اور انور سادات کی حکومت ہی کا تسلسل ہے۔ شام میں ۱۹۶۳ء سے حافظ الاسد کی حکومت ہے اور ۱۹۶۸ء سے عراق میں صدر صدام حسین کا طوطی بول رہا ہے۔ الجزائر میں ۱۹۵۰ء سے ایف-ایل-این کی حکمرانی چلی آ رہی ہے۔ تیونس میں زین العابدین بن علی حبیب بورقیبی کے جانشین ہیں۔ مراکش میں سلطان حسن ۱۹۶۱ء سے کاروبار سلطنت سنبھالے ہوئے ہیں۔ خلیج فارس کے علاقے میں بھی سیاسی استحکام موجود ہے۔ سعودی عرب میں ۱۷۴۵ء سے زمام حکومت ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں ہے۔ جس میں آخری بار جو رکاوٹ آئی تھی اسے بھی ایک صدی گزر چکی ہے۔ خلیج کی

امارات ۱۹۶۳ء میں حصول آزادی کے بعد سے ایک ہی خاندان کے زیر نگیں ہیں۔

جہاں تک انقلاب ایران کا تعلق ہے اس نے عالمگیر پیمانے پر اضطراب اور تشویش کی لہر پیدا کی ہے۔ لیکن بہداد اور رہنما کی تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی قوم پرستی اور اسلام کے امتزاج کے سبب حالات غیر محسوس طور پر ماضی کی صورت حال کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ اگرچہ وہاں خواتین پر شدید پابندیاں عائد تھیں۔ تاہم حداد اور ایس پازٹیو کی جنسی امتیاز پر تحقیق کے مطابق اہل قلم، فن کار اور دانش ور خواتین اسلام کی قدامت پسند سرحدوں کو پرے دھکیلنے اور معاشرے میں خواتین کی حیثیت کے بارے میں صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نئے نئے مباحث کے دروازے کھولنے میں مصروف ہیں۔ محمد خاتمی کے صدر منتخب ہونے کے بعد یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مذہبی حلقوں اور ملاؤں کی بالادستی میں کسی نہ کسی حد تک تخفیف کی جائے۔ آیت اللہ خمینی کے اثر و رسوخ کو ختم کر کے اس کی جگہ مذہبی رواداری کے احیاء کے ضمن میں بھی بڑی محتاط آوازیں بلند ہو رہی ہیں جن کی کامیابی کے بارے میں اندازہ لگانا قبل از وقت ہوگا۔ تاہم حکومت اور قائدین کا یہ تسلسل دیرینہ اور غیر منقطع مسائل کا بھی آئینہ دار ہے۔

اسلام اور سیاسی کلچر

۱۹۶۷ء سے علاقے کے بیشتر ممالک، سیاست پر مسلط امراء اور جاگیرداروں اور اسلامی اقدار کے حامیوں کے درمیان آویزش کا شکار نظر آتے ہیں۔ اس آویزش کے وسیع تر پس منظر پر ایکل مین اور پس کے ٹوری نے اپنی تصنیف میں نظر ڈالی ہے۔ انہوں نے اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے سیاست کی تعریف یوں کی ہے کہ یہ علامات کی تشریح اور اداروں پر تسلط جمانے کا نام ہے۔ اور اس طرح ان کے خیال میں اسلام تنوع اور مسلسل تاویلات سے عبارت ہے جو اس سیاسی اور ثقافتی و تہذیبی عمل پر مبنی ہوتا ہے جو مختلف مفاد پرست گروہوں کے پیش نظر ہوتا ہے۔ غیر سیاسی معاشرتی اور فرقہ وارانہ معاملات میں تعلیمی، فلاحی، پیشہ ورانہ اور جماعتی تنظیم کی تشکیل میں اسلام کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس کام میں علماء صوفی، دانش ور، ڈاکٹر، قانون دان، اساتذہ، سرکاری افسر اور فوج سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سیاسی معاشی اور معاشرتی پروگرام کو مقبول بنانے کے لیے اسلام ہی کے اصولوں کے مدعی بن جاتے ہیں۔

اسلام کو ایک طرف تو سیکولرازم کی مخالفت میں بنیاد بنایا جاتا ہے اور دوسری جانب ایران میں علماء

ریاستی امور میں مذہبی بالادستی کا مطالبہ کرتے ہیں اور وہ تحریکیں بھی اسلام کا سہارا لیتی ہیں جو مذہب اور حکومت کو الگ الگ شعبوں میں رکھنے کی خواہش مند ہیں۔ سعودی حکمران اپنی سلطنت کے نہ صرف جواز کے لیے بلکہ مذہبی امور کی حد بندی کی بنیاد بھی مذہب کو بناتے ہیں۔

ان باتوں سے متعدد نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ علاقے کی سیاست میں ایک بار پھر مذہب کا عمل دخل نظر آ رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلم سیاست تمام تر انقلابی نوعیت کی نہیں ہے۔ تیسری بات امریکی حکمت عملی کے پیش نظر یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر دہشت گردی کے الزام کے باوجود اسلامی تعلیمات کا دامن صاف ہے۔ اردن، مصر، تیونس، یمن اور لبنان کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں مختلف گروہ اپنے اپنے مفادات کے تحت خفیہ سودے بازیوں، مشترک اتفاق رائے والے مباحث میں اسلام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام ایک ایسے متمدن معاشرے کا داعی ہے جس کے اندر مختلف لسانی، سماجی اور ثقافتی مفادات موجود ہوتے ہیں اور آپس میں مل کر مجموعی ترقی کرتے ہیں۔

اسلام اور سیاسی عمل

ایکل مین اور پس کے ٹوری نے اسلام میں تشدد کی تحریکوں کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی اس اہم سوال پر روشنی ڈالی ہے کہ اس کی تنظیم کیسی ہے۔ طریق کار کیا ہے اور کیا ان میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ سیکولر حکومت کی بیخ کنی کر سکیں؟ اس لیے اس خامی کو میڈی، ویزمان اور انبار کے مضامین نے پورا کر دیا ہے۔ ان مضامین میں مشرق وسطیٰ کے ممالک پر حزب اختلاف کی اسلامی تحریکوں کے متنوع اثرات کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

اس کا انتہائی نمایاں ثبوت الجزائر میں فوج اور متعدد اسلامی مخالف تحریکوں کے مابین جنگ کی صورت میں ہے۔ یہ تحریک حکومت پر قبضے کے حصول کے لیے مارنے مرنے کے جذبے سے سرشار ہے جس کی وجہ سے عام الجزائریوں کی ہلاکت میں دونوں فریق ملوث ہیں۔

اسلام پسند خود متعدد گروہوں میں منقسم ہیں جن میں سے فرنٹ اسلامیق ڈی سلوت (Front Islamique De Salut) جیسی چند جماعتیں حکومت سے تعاون پر آمادہ ہیں۔ دوسری جانب گروپس اسلامیقیس آرمیز (Groupes Islamiques Armees) جیسے گروہ حکومت سے مسلح تصادم میں

مصروف ہیں حالانکہ تشدد کی اس لہر کا کوئی سیاسی مقصد نظر نہیں آتا۔ اسٹون نے اپنے تحقیقی مقالے میں الجزائر میں قبائل کے کردار پر پہلی بار توجہ دلائی ہے جو اسلام پسندوں کے مخالف اور حکومت اور فوج کے حمایتی ہیں۔ انہیں اس کا صلہ بھی مل رہا ہے اور بربر ثقافت اور زبان کی تعلیم اب مدارس میں جاری کر دی گئی ہے گویا اس معاملے میں نسل پرستی نے اسلام پرستی کو مات دی ہے۔

مصر میں اسلام سے وابستہ اسلامی تحریکوں کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ تشدد پسند مسلح گروہ سرکاری و فوجی افسروں، دانشوروں اور سینما گھروں اور شراب خانوں پر حملے کرتے ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ اداروں نے مدارس، طبی مراکز، فلاحی ادارے ان علاقوں میں قائم کیے ہیں جو سرکاری سرپرستی سے بوجوہ محروم ہیں۔ مصنفوں، ڈاکٹروں، صحافیوں کی انجمنوں میں بھی ان کا غلبہ ہے۔ ثقافتی اور معاشرتی امور میں اسلام جتنا موثر اب ہے پہلے کبھی نہیں تھا۔

حکومت اسلامی تحریکوں کی حتی الوسع مزاحمت کر رہی ہے تاہم اسے مسلح گروہوں پر پوری طرح قابو حاصل نہیں ہوا ہے۔ سیاسی جماعتیں، ذرائع ابلاغ، مدارس اور فلاحی ادارے مکمل طور پر حکومت کے قابو میں ہیں۔ میڈی وزمان اور انبار کی تالیف میں شامل ایلی پودا کے مقالے میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ فوج اسلامی اثر و نفوذ سے مبرا اور حکومت کی وفادار ہے۔ جنگجو اسلامی تحریکیں گروہوں میں بٹی ہوئی ہیں ان کے پاس کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جو پرکشش ہو اور عوام میں مقبول بھی ہو۔ وہ حکومت کے استحکام میں کوئی دراڑ پیدا نہیں کر سکی ہے۔ اس لیے معاشرے پر غلبہ پانے کے امکانات تقریباً بالکل ہی مفقود ہیں اور حکومت اور اسلام پسندوں میں مصالحت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بے چارے مصری عوام دہشت گردی اور مطق العنانی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے ہیں۔

''عربوں کے خواب محل'' کے مصنف فواد عجمی نے عرب ثقافت اور ذہنی رجحانات پر بڑی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کے خیال میں مصر کا متوسط طبقہ مذہبی اور لادینی اقدار کے درمیان منتشر ہو کر رہ گیا ہے۔ مصری حکومت نے روشن خیال مذہبی حلقوں کی حوصلہ افزائی کے خیال سے خطیبوں، صوفیوں اور مذہب کے احیاء کی تحریکوں کو بہت حد تک آزادی دے رکھی ہے لیکن عجمی کی رائے میں یہ اقدام بے ثمر ثابت ہو رہا ہے کیونکہ وہاں معاشرے پر کٹر مذہبی حلقوں کا تسلط قائم ہے جس سے معاشرتی اصلاح کا کام

آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ سیکولر دانش وروں اور صحافیوں کا قتل، قبطیوں پر قاتلانہ حملے اور مشہور اہل قلم نجیب محفوظ * پر حملہ، روشن خیال مذہبی عالم نصر حامد ابوزید ** کی جلاوطنی مصری معاشرے میں انحطاط کی نشان دہی کرتے ہیں۔

تاہم چند اسلامی تحریکیں ایسی بھی ہیں جو اسلامی حکومتوں کی تشکیل کے مطالبوں میں لچک پیدا کرنے پر مائل ہو رہی ہیں۔ گبریل وارنگ نے اپنے مقالے میں، جو میڈی ویزمان اور انبار کی تالیف میں شامل ہے اس مسئلے کا ذکر کیا ہے، سوڈان کی حکومت کو جس کا سامنا ہے۔ وہاں اسلامی اور عربی شناخت کی ترویج کے سبب جنوب کے صوبے میں جہاں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، آویزش جاری ہے۔ حکومت یہ جنگ جیت نہیں سکتی اس لیے ملک کی تقسیم ناگزیر نظر آتی ہے۔ اس کے سبب داخلی طور پر دباؤ بڑھ رہا ہے کہ شریعت کے نفاذ کے پروگرام کو واپس لے لیا جائے۔

لبنان میں ہر چند کے حزب اللہ موجودہ سیاسی نظام پر نکتہ چینی کرتی ہے اور نظام اسلام کی داعی ہے لیکن اس میں گروہ بندیاں جنم لے چکی ہیں۔ چند گروہ لبنان کی سیاست میں مقام حاصل کرنے کے لیے اپنی تحریک کو ملتوی کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ حزب اللہ نے ۱۹۹۲ء کے عام انتخابات میں حصہ لیا اور معاشرتی بہبود کے کاموں کے لیے ابتدائی تیاریوں میں بھی مصروف عمل ہے۔ اسی طرح حماس کی تحریک جو فلسطینی حکومت کی حدود میں رہتے ہوئے مصروف عمل ہے آپس میں بٹی ہوئی ہے۔ دوسری جانب کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو اس حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔ حقیقت پسندی کے اس رجحان کی طویل مدت کی حکمت عملی کے طور پر کوئی آزمائش نہیں ہوئی ہے لیکن شدید اسلام پسند تحریکوں میں یہ رجحان کسی گنجلک حقیقت کا آئینہ دار ہے جس کے وسیع البنیاد نتائج کے امکانات اس سے قبل کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

دیگر ملکوں میں حکومت کو بالادستی حاصل ہے۔ ترکی، تیونس، مراکش، شام اور اردن میں اسلامی

---

* نجیب محفوظ مصر کے رسوائے زمانہ مصنف ہیں جنہوں نے اپنی کتب میں اسلامی تعلیمات، اقدار اور روایتوں کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے۔ اسلامی حلقوں کی طرف سے انہیں واجب القتل قرار دیا جا چکا ہے۔ اسی وجہ سے ان پر کئی ایک قاتلانہ حملے بھی ہو چکے ہیں۔ (مدیر)

** نصر حامد ابوزید بھی قرآن کی ایسی تعبیر نو کے قائل ہیں جسے امت کے سواد اعظم نے مسترد کر دیا ہے۔ (مدیر)

تحریکوں کو پابند رکھا گیا ہے۔ ان کی سیاسی قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ ان ممالک میں اسلام ایک تمدنی قوت ہے سیاسی نہیں۔

فلسطینی اور اسرائیلی

ایک ہی ملک میں دو قوموں کے متوطن ہونے کے دعوے داروں کے مابین کسی مفاہمت کے آثار نظر نہیں آتے اور فریقین ایسے افراد میں منقسم ہیں جن میں سے کچھ تو اس مسئلے کو تاریخی بنیاد پر حل کرنے کے حامی ہیں اور کچھ پورے فلسطین نہ سہی اس کے زیادہ سے زیادہ حصے پر تسلط جمانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ فلسطینی ریاست پر ابن سن کی تصنیف میں فلسطین کے مسئلے پر زیادہ گہرائی سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں یہ یاد دلایا گیا ہے کہ قدیم زمانے سے فلسطین کے عوام کی رہنمائی کا بار امراء اور رؤسا نے نسلاً بعد نسلاً اٹھایا ہے۔ وہی تھے جو سلطنت عثمانیہ، برطانیہ، اردن، مصر اور اسرائیل کے حکمرانوں سے رابطہ رکھتے تھے۔ ان کے اثر و رسوخ کی عمارت مذہبی عقائد، زمین کی ملکیت اور کاشتکاروں کے مربی ہونے کی بنیاد پر استوار تھی۔

۱۹۸۰ء سے ایسے ہی خاندانوں کی نئی نسل نے مغربی کناروں کے شہروں کی کونسلوں کی سربراہی سنبھال رکھی ہے۔ گویا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اگرچہ موجودہ نسل قوم پرستی کی زیادہ قائل ہے تاہم وہ اسرائیلی حکومت کے تحت کام کر کے پی-ایل-او کے مقامی اثر و رسوخ کو محدود کرنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے دوران ان قدیم خاندانوں کے اثر و رسوخ میں چند تبدیلیوں کی بنا پر نمایاں کمی آئی۔ زمینوں کی ضبطی کے اسرائیلی منصوبے کے تحت ان کے رسوخ کی بنیاد ختم کر دی گئی۔ فلسطینی کاشتکار زمین سے قطع تعلق کر کے اسرائیل میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگے۔ مزید برآں تعلیمی سہولتیں مہیا ہونے کے سبب کاشتکاروں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اور شہر میں رہنے والے پیشہ ور افراد اس لائق ہو گئے کہ پرانی نسل اور خود اسرائیلیوں کے مقابل آ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح جاندار متوسط طبقے نے پی ایل او اور قدیم نسل کے ہاتھوں سے قیادت چھین لی ہے۔ انہوں نے مدارس، طبی سہولتوں کے ادارے، کاشتکاروں کی بحالی کی انجمنیں اور دیگر بنیادی ادارے قائم کر کے قومی سطح پر ایک

فلسطینی معاشرے کی بنیاد رکھ دی ہے۔

اسرائیل مخالف انتفادہ تحریک کے دوران مقبول عام مقامی جماعتوں نے نئی نسل کو بھی قیادت سے محروم کر دیا۔ نوجوانوں کے گروہوں نے مزاحمت کی تحریک کو مقامی سطح پر منظم کیا اور حکومت سے ساز باز رکھنے والوں اور غداروں کو اپنے طور پر کیفر کردار تک پہنچایا۔ یہ انقلابی تحریک ستمبر ۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے کے بعد ختم ہوگئی۔ پی ایل او، غازہ اور مغربی کنارے پر واپس آ گئی اور متوسط طبقے کے بااثر افراد کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ پی ایل او نے مطلق العنان فوج، پولیس اور خفیہ اداروں اور انتظامیہ کے ذریعے یاسر عرفات کے نظریات کی ترویج کی۔ ذرائع ابلاغ کو خوفزدہ کیا، قدیم خاندانوں سے تعلق رکھنے والوں، اپنے مخالفین اور نوجوانوں کی جماعتوں کو ختم کیا جنہوں نے اسرائیل کے خلاف مزاحمت کی تحریک کامیابی سے چلائی تھی۔ اسرائیلی آبادکاروں کے مسئلے اور یروشلم کو اپنا صدر مقام بنانے کے دعوے میں ناکامی کے سبب پی ایل او فلسطینی آبادی پر جبر و تشدد کر کے اپنے وجود کا جواز پیدا کرنے پر مجبور ہے۔

اس ضمن میں پی ایل او کے اصل مقابل حماس اور اسلامی جہاد ہی ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں ۱۹۸۰ء کے دوران الاخوان سے علیحدہ ہو کر وجود میں آئیں۔ یہ اسرائیل کے خلاف مزاحمت جاری رکھنا، پی ایل او کی حکمرانی کو ختم کرنا اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کی خواہاں ہیں۔

حال ہی میں حماس نے ان تمام جماعتوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے جو عرفات کے خلاف ہیں۔ حماس اصولاً فلسطین میں صلح کے عمل کی مخالف ہے۔ اس کے مسلح گروہ اسرائیلی عسکری حملوں کے شدید جواب دیتے ہیں۔ تاہم فلسطین کی حدود میں ان کا عمل بڑا محتاط اور معقول ہے۔ صلح کے عمل کی مخالفت کے باوصف حماس فلسطین کی سیاست میں عمل دخل کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اور اس ضمن میں عرفات اور فلسطینی حکومت سے کسی نہ کسی حد تک مفاہمت پر آمادہ ہے۔ دوسری جانب عرفات کو حماس میں اختلافات پیدا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس طرح فلسطین میں مقیم حماس کے کارکنوں اور بیرون فلسطین کارکنوں میں اختلاف نمایاں ہے جو اسرائیل سے ہر قسم کی مفاہمت کے مخالف ہیں۔ تاہم فلسطین میں ایسے چھوٹے چھوٹے مسلح گروہ موجود ہیں جنہوں نے اسرائیل کے خلاف تشدد آمیز جدوجہد جاری رکھی ہے۔ لیکن سیاسی مزاج رکھنے والے، عرفات کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ انتخابات میں

حصہ لینے پر بھی حماس میں اختلافات موجود ہیں۔ حماس فلسطین حکومت کا تختہ الٹنے کے حق میں نہیں ہے۔ اس لیے امریکہ اور اسرائیل کے شدید دباؤ کے باوجود عرفات حماس سے تعلقات میں بڑی احتیاط برت رہے ہیں۔ انہوں نے حماس کو مکمل طور پر غیر مسلح نہیں کیا ہے اور گرفتار شدہ اراکین کو عموماً رہا کر دیا جاتا ہے۔

فلسطین کی سخت کشیدہ سیاسی صورت حال کے بارے میں عجمی نے وہاں کے دانشوروں اور ادیبوں کے خیالات کا بڑی چابکدستی سے اظہار کیا ہے۔ اگرچہ صلح کے معاہدے کی حمایت میں چند آوازیں اٹھتی ہیں لیکن ان کی اکثریت ان معاہدوں کی مخالف ہے۔ زیادہ فلسطینی دانش ور وطن سے باہر زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ہمہ وقت وطن کی سہانی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ وہاں گزرے ہوئے سنہری لمحے انہیں بے تاب رکھتے ہیں۔ زندگی کے حقائق پر یہ خواب چھائے رہتے ہیں۔

ناتن یاہو کی حکومت کی حکمت عملی کے باعث فلسطینیوں کے لیے آسان اور معقول راستہ یہی ہے کہ وہ سنہری مستقبل کی امیدوں اور ماضی کے خواب محل سے آنکھیں پھیر لیں۔ دانشوروں اور ادیبوں کو یہ بھی قلق ہے کہ وہ فلسطین کی سیاسی بساط سے دور ہیں اور انہیں تشویش ہے کہ اسرائیل سے صلح سے ان کی جلاوطنی طویل سے طویل تر ہو جائے گی۔ ان کو یہ بھی خوف ہے کہ رفتہ رفتہ سیاسی عوامل ماند پڑ جائیں گے اور اقتصادی ترقی مغربی ثقافت کی گرفت مشرقِ وسطیٰ پر مضبوط کر دے گی۔ اس صورت حال میں جدیدیت اپنی شناخت پر حاوی ہو جائے گی اور قیادت دانشوروں کے ہاتھوں سے نکل کر نئے امراء کو منتقل ہو جائے گی۔

شیمویل سینڈلر کے مقالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تصادم اسرائیل کے لیے بھی کم پیچیدہ نہیں ہے۔ میڈی، ویزمان کی تالیف میں اس کے دو مقالے شامل ہیں۔ اس کے تجزیہ کے مطابق ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے ایک نئی قسم کی صیہونیت نے سر اٹھایا ہے جس نے فلسطین کی بقایا سرزمین کے حصول کو مذہبی رنگ دے کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسی طرح یہودی قوم کو نجاتِ اخروی حاصل ہو سکے گی۔ اس ضمن میں سینڈلر نے اس کٹر فرقے کی قوت کا بھی اندازہ لگایا ہے کہ وہ کسی حد تک مذہبی تحریک کو جاری رکھ سکتا ہے اور مقبوضہ علاقوں میں عربوں سے مسلح جدوجہد میں حصہ لے سکتا ہے۔ اضحاک رابن کے قتل کے بعد اس

اندیشے کو نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اب حکومت میں مذہبی گروہوں کو نمائندگی دے کر ایسے شدت پسندوں کو سیاسی عمل سے دور کر دیا گیا ہے۔ اسرائیلی قومیت اور یہودی مذہبیت، صیہونی حب جاہ میں برابر کی شریک ہیں۔ اس اتحاد سے شدت پسندی کو بڑی حد تک قابو میں رکھا گیا ہے لیکن اسی کے باعث اسرائیلی حکومت فلسطینیوں سے غیر مفاہمانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور رہتی ہے۔

اسرائیل اور فلسطین دونوں پر شدید مذہبی سیاسی دباؤ اوسلو صلح کے عمل میں سدراہ بنا ہوا ہے۔ ان سب لوگوں کے لیے لفظ صلح منفی اثرات کا حامل ہے جو صہیونی توسیع کے توسط سے نجات اخروی کے یا عرب کی فتح کے خواہاں ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر مشرق وسطیٰ میں معاشی اور معاشرتی اتحاد رونما ہوتا ہے تو اس سے مقامی، قومی اور مذہبی شناخت پر زد پڑے گی۔

اس پیچیدہ صورت حال میں سلامتی کے مسائل نہایت شدید ہیں۔ ماوز نے اپنی کتاب میں ایسے متعدد مسائل کی نشان دہی کی ہے۔ متعدد اسرائیلیوں کا یہ خیال ہے کہ دہشت گردوں کے حملوں پر اس وقت تک قابو نہیں پایا جا سکے گا جب تک فلسطینی گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں گے۔ اوسلو کے صلح کا عمل اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوگا جب تک عراق، ایران اور شام جو دور مار میزائلوں سے مسلح ہیں صلح کے عمل میں شریک نہیں کیے جاتے۔ اس صورت حال میں فلسطینی ریاست کے قیام سے اسرائیل پر قبضے کے منصوبے کو ہوا دی جائے گی اور مخالفین کو اس ریاست کو اسرائیل مخالف مرکز بنانے کا موقع ملے گا۔ اسرائیلیوں کو یہ بھی تشویش ہے کہ اسلامی حکومتوں کے قیام سے امن کا موجودہ عمل پیچھے چلا جائے گا۔ صیہونیت یا سلامتی کے استحکام یا دونوں کے پیش نظر ناتن یاہو کی حکومت فوجی قوت میں اضافے یا جوڑ توڑ کے ذریعے دباؤ ڈالنے کو ترجیح دے گی۔

اس رجحان کو فیلڈ مین اور ٹوکان نے اپنی کتاب میں خطرناک خود فریبی قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل ہے کہ سیاسی معاہدے مسلح تصادم کے امکانات میں تخفیف کا باعث ہوتے ہیں۔ مزید برآں سلامتی کے لیے اسلحہ کے انبار لگانے کو فریق ثانی دھمکی اور اشتعال انگیزی قرار دیتا ہے۔ فوجی سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ دونوں جانب سے باہمی اعتماد پیدا کرنے کے لیے ضروری اقدام کیے جائیں جس سے سیاسی صورت حال میں بھی تبدیلی آجائے گی اور سلامتی کے مواقع میں بھی صحیح معنوں میں اضافہ ہوگا۔

علاقائی سلامتی کے مسائل

مشرقِ وسطیٰ کے وسیع تر تناظر میں، ہوسکتا ہے کہ، اسرائیل عرب مسائل زیادہ سنگین نہ ہوں۔ ان مسائل کو کیمپ نے اپنی کتاب میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اور علاقے کے جنگی حکمت عملی کے مسائل پر ہارکسوی نے تفصیلی بحث کی ہے جو ماوز کی تصنیف میں شامل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ برس ہا برس تک عرب خلیج کے علاقے دنیا کے لیے خام تیل کی فراہمی کا اہم ترین ذریعہ بنے رہیں گے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں خلیج کے علاقوں میں دو جنگیں ہو چکی ہیں جن میں انسانی جانوں کا اتلاف عرب اسرائیل جنگ سے کہیں زیادہ ہوا ہے۔ اسی خلیج کے علاقے کے تقریباً تمام ممالک سرحدی تنازعات کا شکار رہتے ہیں۔ عراق اور ایران، متحدہ عرب امارات اور ایران، قطر اور بحرین، سعودی عرب اور کویت، قطر اور یمن اور شمالی اور جنوبی یمن میں سرحدی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ جنگ کے دہانے پر بیٹھے ہوئے اس خطے سے امریکہ براہ راست متاثر ہے کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس علاقے کے ممالک اس کے علاوہ کسی دیگر ملک یعنی سابق روس یا ایران اور عراق کے دائرہ اثر میں آ جائیں۔

کیمپ اور ہارک وی نے پانی کے روز بروز گھٹتے ہوئے ذرائع پر اس علاقے میں ترکی اور شام کے مابین جنگ کے امکانات کا بھی ذکر کیا ہے۔ دجلہ و فرات کے طاس میں ترکی اور عراق، دریائے اردن کے طاس میں اسرائیل، شام اور اردن، اور دریائے نیل پر مصر اور سوڈان کے درمیان پانی کی تقسیم کے مسائل موجود ہیں۔ انہوں نے افغانستان، عراق اور آذربائی جان میں علیحدگی کی سیاسی تحریکوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مزید برآں سوڈان، افغانستان، الجزائر، لبنان اور ترکی میں بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کا حال بھی انہوں نے بیان کیا ہے۔ اسی طرح عراق، کویت، سعودی عرب، بحرین اور لبنان میں شیعہ آبادی کی بے چینی پر بھی نظر ڈالی ہے اور کہا ہے کہ نسلی قوم پرستی اور مذہبی مفاد پرستی کس طرح موجودہ حکومتی نظام کے لیے خطرہ بنتی جا رہی ہے۔ کیمپ اور ہارک وی نے فوجی مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے جس میں روائتی جنگ کے لیے حالیہ جنگوں سے حاصل شدہ سبق بڑے پیمانے پر ہلاکت خیز اسلحہ کا جنگی حکمت عملی میں کردار اور مستقبل کی جنگ کے ممکنہ مناظر بھی شامل ہیں۔

ترکی اور کرد مسئلہ

اب تک جن مسائل کا ذکر ہوا ہے وہ مشرقِ وسطیٰ کی حالیہ تاریخ میں تسلسل کے آئینہ دار تھے۔ لیکن ترکی غیر متوقع اور غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہے جس کی بین الاقوامی حیثیت اور معاشی ترقی میں گزشتہ دس برس میں نمایاں تغیر ہوا ہے اور اس کے اندرونی مسائل میں شدت آ گئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ترکی کی حکومت جمہوری بھی ہے اور فوجی بھی۔ فوج خود کو ترکی کی اصل روایات کی نگران سمجھتی ہے اور مغرب اور جدید خیالات کو ترکی قومیت کی شناخت قرار دیتی ہے۔ فوج نے ۱۹۶۰ء، ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۱ء میں اس وقت حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی جب اسے یہ محسوس ہوا کہ دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں کے خیالات مقبول ہو رہے ہیں اور ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ حکومت کی حکمت عملی کو مسترد کرنے کا اختیار فوج کو حاصل ہے جس کا طریق کار قومی سلامتی کونسل نے متعین کیا ہے۔

ترکی کی تغیر پذیر صورت حال میں روس کے حصے بخرے ہونے، وسط ایشیا میں آزاد خود مختار ریاستوں کی تشکیل اور بلقان میں قومیت کی بنیاد پر مسلح تصادم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خلیجی جنگوں نے بھی ترکی کی بین الاقوامی حیثیت میں پیچیدگی پیدا کر دی۔ ان عوامل کے سبب بحیرۂ ایڈریاٹک سے چین کی سرحدوں تک کی سلامتی میں ترکی کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

بلقان میں ترکی بڑی محتاط حکمت عملی پر کاربند ہے اور ہر طرح کے تصادم سے دامن بچا رہا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بوسنیا کے مسلمانوں سے گہری مماثلت کے باوجود ان کی صرف سفارتی مدد کرتا رہا ہے۔ کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ وہاں مسلمان اور عیسائی باشندوں کے درمیان محاذ آرائی کی فضا پیدا ہو۔ ان میں امن اور باہمی معاہدوں کا فروغ اس کے حق میں ہے۔ ترکی نے کوہ قاف اور وسطی ایشیا کی نوزائیدہ آزاد کم ترقی یافتہ ریاستوں کے لیے بحیرہ اسود معاشی تعاون کونسل قائم کر کے قیادت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے لیے اس نے اس علاقے میں ترقی کی بنیادی ضرورتیں فراہم کی ہیں جن میں طلباء کے تبادلے، اور وسطی ایشیا کی ترکی زبان کے لیے نئے رومن رسم الخط کی تشکیل شامل ہے۔

اس علاقے میں ترکی کے اثر و نفوذ میں روس رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے جو خود کو ان ریاستوں کا حسب

سابق مربی خیال کرتا ہے۔ اس ضمن میں آذربائیجان اور آرمینیا، ازبکستان اور تاجکستان، روس اور چیچنیا کے درمیان تنازعات، اسٹونیا اور ابخازیا کے جارجیا سے آزادی کے مطالبے اور تاجکستان میں خانہ جنگی کے سبب ترکی کے مقابلے میں روس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح مقامی تیل اور گیس کی ترسیل کے لیے متبادل پائپ لائن کی تنصیب کے لیے بھی روس اور ترکی میں رقابت موجود ہے۔

جنوبی علاقے میں کردوں کا مسئلہ ترکی کے لیے اذیت کا سبب بنا ہوا ہے۔ میکڈویل اور اوسلون نے اپنی تصانیف میں کردوں کی حالیہ تاریخ اور تحریک کا تجزیہ یا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اور اس مسئلے کی پیچیدگیوں پر قارئین کی توجہ دلائی ہے۔ کرد زبان بولنے والوں کی تعداد دو تا ڈھائی کروڑ ہے جو ترکی، ایران، عراق اور شام میں آباد ہیں۔ جنگ عظیم اول کے بعد علاقے میں متعدد آزاد ریاستوں کے قیام سے کردوں کی قومی حکومت کا خواب بھی بکھر گیا اور انہوں نے ہر ریاست میں اپنے لیے خودمختاری، آزادی اور اتحاد کی جدوجہد گزشتہ دس برس سے جاری رکھی ہے۔ تاہم وہ قیادت اور مقامی فوائد کے لیے آپس میں بھی دست و گریبان رہتے ہیں۔ اس طرح ہر حکومت کو کردوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہو جاتا ہے۔

خلیجی جنگ کے بعد ترکی میں کردوں کی آویزش میں نئی روح بیدار ہوگئی۔ کرد محنت کش جماعت (پی کے کے) نے ترکی میں وفاقی نظام حکومت اور علاقائی خودمختاری کے لیے مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ ترکی کی حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی۔ کرد دہشت گردوں نے حملے شروع کر دیے۔ حکومت نے قبائلی تعصبات کو ہوا دی، کرد آبادیوں کو جنگی اہمیت کے لحاظ سے نئی ترتیب دی۔ عراق کی سرحد کے اندر کرد علاقوں پر فوج نے حملے کیے ان تمام اقدامات نے ایک بھرپور جنگ کو جنم دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ فی الحال ترکی کے اپنے ہمسایہ ملکوں سے تعلقات کا دارومدار اس کرد مسئلے پر ہے۔ عراق کے کمزور ہونے اور کردوں کے لیے ایک جزوی طور پر محفوظ علاقے کی تشکیل کے بعد کرد محنت کش جماعت کو ترکی کے خلاف کام کرنے کے لیے ایک مرکز فراہم ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکی اور ایران نے اپنے اپنے حلقہ اثر کے لحاظ سے شمالی عراق کو تقسیم کر لیا ہے۔ کرد جمہوری پارٹی کو ترکی کی حمایت حاصل ہے اور ایران کردستان کی محب وطن پارٹی کی مدد کر رہا ہے۔ کردوں کے گروہ آپس میں دست و گریبان

رہتے ہیں۔ ترکی نے جمہوری پارٹی کے تعاون سے محب وطن پارٹی کو کچلنے کے لیے شمالی عراق پر بارہا فوجی حملے کیے ہیں۔ کردوں کی باہمی چپقلش کے باعث عراق کو شمالی کردستان کے علاقے میں اپنے اثر ورسوخ کے احیاء کا موقع مل گیا ہے اور اس طرح صدر صدام حسین کے خلاف کردوں کے لیے ایک آزاد کردہ علاقے کی تشکیل کا امریکی منصوبہ ناکام بنادیا گیا ہے۔

لاسن نے اپنی کتاب میں ترکی اور شام کے تعلقات پر قلم اٹھایا ہے۔ جن میں کشیدگی کا سبب بھی کرد مسئلہ ہے۔ شام کردستان محب وطن جماعت کا حامی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مابین سرحدی تنازعہ بھی موجود ہے۔ ترکی دریائے فرات سے پانی کی فراہمی کا رخ تبدیل کرنے کی دھمکی دے رہا ہے اور شام کو کردوں کی حمایت سے دست کش کرنے کے لیے اسرائیل سے پینگیں بڑھا رہا ہے اور کردوں کے سبب روس سے بھی ترکی کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ روس، چیچنیا اور آزاد مملکتوں کے لیے ترکی کی مداخلت کو روکنے کے لیے جلاوطن کردوں کی کانفرنسیں منعقد کراتا رہتا ہے۔

ترکی نے کردوں کو دبانے کے لیے جو سخت اقدامات کیے ہیں اس کا سیاسی اثر یورپ پر بھی پڑا ہے۔ ترکی کو یورپین یونین میں داخلہ نہیں مل رہا ہے حالانکہ اس کی ۵۲ فی صد برآمدات اور ۴۴ فی صد درآمدات اسے یورپی ملکوں سے مربوط کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ یورپین کسٹم یونین کا بھی رکن ہے اگرچہ برطانیہ اور فرانس ترکی کے کردوں کے ساتھ سلوک کو نظر انداز کر رہے ہیں تاہم دیگر یورپی ممالک خصوصاً یونان ترکی کی رکنیت کا مخالف ہے اور جرمنی کو یہ تشویش ہے کہ اس طرح ترک محنت کشوں کے لیے ترک وطن کا آسان سا موقع فراہم ہو جائے گا۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ کسی اسلامی ملک کی یورپی اتحاد میں شمولیت سے ہچکچاتے ہوں۔ اس طرح یورپ میں ضم ہونے کا ترکی کے جدیدیت پسندوں کا خواب کرد مسئلے کے سبب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو رہا ہے۔

کرد مسئلہ ترکی کے داخلی بحران کو شدید سے شدید تر بنا رہا ہے جس کا ذکر بازدوگان اور کسابہ کی تصنیف میں موجود ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ترکی کے ترقیات عمل کی حکمت عملی کی بنیاد یہ ہے کہ درآمدات کے متبادل ملک میں اپنے ذرائع سے پیدا کیے جائیں۔ جس کے لیے بنیادی ضروریات فراہم کی گئی ہیں تاکہ لوگوں کی روزمرہ کی ضرورتیں مقامی طور پر ہی پوری ہو جائیں۔ ترکی ایک فلاحی حکمت عملی پر بھی کاربند ہے

تا کہ صنعتوں کے ذریعے سرکاری ملازمین، انتظامی عہدیداروں، کارکنوں، فلاحی اور اس طرح کے دیگر کام کرنے والوں کو روزگار میسر آئے۔ لیکن اس حکمت عملی پر عمل درآمد کے اخراجات جب حد سے بڑھ گئے تو ترکی نے اپنی معیشت کا رخ برآمدات کی طرف موڑ دیا لیکن اس اقدام سے معاشی مسائل میں اضافہ ہوا اور روزگار کے مواقع کم ہونے کی وجہ سے بے روزگاری میں اضافہ ہو گیا۔

اس سے ثقافتی اور سیاسی امور کو دو صورتوں میں نقصان پہنچا۔ اول یہ ہے کہ اسلامی نظریے اور رفاہ پارٹی کو فروغ حاصل ہوا جو نہ صرف اسلامی اقدار کی حامی جماعت ہے بلکہ حکومت کی مطلق العنانیت کی بھی مخالف ہے۔ اس نے اقتصادی ناکامی سے بھی فائدہ اٹھایا اور انتخابات میں مقبول ترین جماعت بن کر ابھری۔ ۹۷-۱۹۹۶ء میں نجم الدین اربکان قدامت پسند جماعتوں کی حمایت سے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مشرقی صوبے میں کردوں کی وفاقی نظام میں خود مختاری اور آزادی کے مطالبے میں بھی شدت آ گئی اور حزب اختلاف سے ان کے تعلقات استوار ہوئے۔ رفاہ (اسلامی) پارٹی کچھ عرصے تک احتجاج کے لیے اکلوتی قانونی سیاسی جماعت بنی رہی جس کے باعث اسے کردوں کی قابل قدر حمایت حاصل ہوئی۔

سیاسی لحاظ سے انتہائی کشیدگی کے اس دور میں فوج نے سخت اور حاکمانہ رویہ اختیار کیا اور سیکولر (مذہب مخالف) حکمت عملی میں شدت پیدا کی۔ اس نے رفاہ پارٹی کو حکومت سے علیحدگی پر مجبور کر دیا اور حال ہی میں ترکی عدالت نے اسے غیر قانونی جماعت قرار دیا ہے اور اس کے متعدد قائدین کو سیاست میں شرکت سے منع کر دیا ہے۔ فوج نے کردوں کی مزاحمتی تحریک کو کچلنے کے لیے سخت اقدامات شروع کیے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کردوں کا خود مختاری کا مطالبہ مملکت کے لیے باعثِ خطر ہے۔ حکومت نہ صرف کردوں کو دبانے کی تحریک چلا رہی ہے بلکہ اسی بہانے ملک پر پولیس راج قائم کیے ہوئے ہے۔ اور پوشیدہ اور کھلم کھلا طور پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں عام ہیں۔ فوج سیاسی اور قانونی آزادی پر پابندیوں کے ختم کرنے کے بھی خلاف ہے اور مصطفیٰ کمال کے سیکولر اور مطلق العنان اصولوں کی بقا کے لیے ذرائع اور تعلیمی اداروں پر فوج کڑی نظر رکھتی ہے۔ سیکولر نظریات کٹر اسلامی اور نسلی شناخت کو یکسر قانونی اور جائز تسلیم نہیں کرتے۔

اس طرح سیاسی عمل میں کردوں کے مفاد کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں۔ نہ صرف فوج بلکہ دائیں بازو کی قومی ایکشن پارٹی بھی کردوں کے علیحدہ قومی وجود کو تسلیم نہیں کرتی۔

قدامت پسند

ٹرو پاتھ اور مدر لینڈ پارٹیاں ''کرد حقیقت'' کو تسلیم کرتی ہیں۔ تاہم انہیں سیاسی حقوق دینے یا ان سے مذاکرات کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حکومت نے کرد پیپلز لیبر پارٹی (ایچ-ای-پی) اور اس کی جگہ لینے والی ڈیموکریٹک پارٹی آف پیپل جیسی سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی ہے تاکہ اس پر سیاسی مذاکرات کے دروازے بند ہو جائیں یا یہ کہ سیاسی مذاکرات کے لیے سرے سے کوششوں کا آغاز ہی نہ ہو۔ جدید جمہوری تحریک جس کے قائد جیم بوائر ہیں کردوں کی ثقافتی اور لسانی حیثیت کو تسلیم کرتی ہے اور کردوں سے اس طرح کے مذاکرات کی حامی ہے جس سے ریاست کے اتحاد پر کسی قسم کی کوئی زد نہ پڑے۔ یہ جماعت تجارتی حلقوں کی مضبوط حمایت اور آزاد اقتصادی عمل کی حامی ہے اور کوشش کر رہی ہے کہ کرد مسئلے کے سیاسی حل کے لیے بڑی جماعتوں کی بھی حمایت حاصل ہو۔

مسلم یا کرد سیاسی اور ثقافتی مطالبات کی فوج کی شدید مخالفت اور سختیوں کی بنیاد ترکی کی یک جہتی اور اتحاد کا تصور ہے۔ فوج ترک قومیت کو اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھتی ہے۔ ترکی عوام ترک قومیت کے حامی، اقلیتوں کے حقوق یا متعدد نسلی اور ثقافتی وحدتوں کے قائل نہیں ہیں۔ ترکی حکومت آبادی میں نسلی اور مذہبی امتیازات کو ختم کر کے ایک متحدہ قومیت کی تشکیل کی پابند ہے۔

کردوں کے حقوق اور سیاست میں اسلام کے نفوذ کے مسائل ہی ترکی کی شناخت بن چکے ہیں۔ سیکولر خیالات کے حامی اسلام پسندوں اور کردوں کے باہمی اختلافات نے مشترک معاشرے میں ایک بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے اور حکومت کی سخت گیری اور کردوں اور اسلام پسندوں کی تحریک نے ترکی کے جمہوری اور پارلیمانی نظام کو سخت آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔

خلاصہ مُباحث

مشرقِ وسطیٰ میں نمایاں ترین پہلو سیاست اور سیاسی کلچر کا تسلسل ہے، جو روز بروز طوائف الملوکی کا

شکار ہوتا نظر آ رہا ہے۔ بیشتر ممالک پر مطلق العنان حکمران یا فوج قابض ہے جنہیں عوام کے حقوق کا کوئی پاس نہیں ہوتا۔ انہوں نے بے شمار تنازعات کو جنم دیا ہے۔ لیکن کوئی ایسا بین الاقوامی ادارہ نہیں ہے جو ان اختلافات کو طے کرانے میں معاونت کرے۔ علاقائی بین الاقوامی تعلقات آج تک امراء کی خودغرضی، قومی مفاد اور اختیارات کے حصول کی جدوجہد کے گھسے پٹے الفاظ کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ لوگوں کی خوشحالی کے لیے مل جل کر رہنے، سیاسی مفاہمت اور معاشی تعاون کو پس پشت ڈال کر نظریاتی، قومی فرقہ وارانہ اور مذہبی مقاصد کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مختصراً یہ علاقہ ابھی اس طرح پیش بینی اور سیاسی دانائی کے لیے تیار نہیں جو روس کے حالیہ زوال کی تہ میں نظر آتی ہے۔